قدیم اُردو نثر کا ارتقائی جائزہ

تنویر غلام حسین
پی ایچ ڈی اسکالر (اردو)
اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

DEVELOPMENT OF ANCIENT URDU

Tanveer Ghulam Hussain
PhD Scholar (Urdu)
Punjab University Oriental College, Lahore

Abstract

Urdu language started its literary journy with poetry. At first, some lines of Urdu were traced in religious magazines. These samples denote that there was no specified rules for Urdu literature; only daily routien discussion was necessary which was mainly influenced by Persian. Prose in *Sab Ras* seems to be in rhymed Urdu. From here Urdu literature started taking its roots afterwards in North part of the sub-continent and it obtained simplicity in the form of *Karbal Katha* and *Nau tarz-e-Muarssa* added colour to it. The article sheds light on developmemt of ancient Urdu and taking its standard shape before Fort William College.

Keywords:
خواجہ بندنواز گیسودراز، اشرف جہانگیر سمنانی، امیر خسرو، بابا فرید گنج شکر، دکن، کربل کتھا، قدیم، اُردو نثر، بہمنی سلطنت

اُردو کے قدیم نثری ادب پر گفتگو سے پہلے اس کی حدود مقرر کرلینی مناسب ہوں گی۔ ابتدائی اردو نثر کے ارتقا کو اگر ہم فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے یعنی ابتدا سے لے کر بارہویں صدی ہجری یا اٹھارویں صدی عیسوی تک محدود کرلیں تو قدیم نثرِ اُردو کی نگارشات اور اُسلوب بیان کے سمجھنے میں سہولت رہے گی۔ اس طرح اُردو نثر کے دو ادوار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پہلا دور قدیم دکنی اردو نثر: دوسرا دور شمالی ہند میں کربل کتھا از فضلی کی تصنیف سے لے کر تحسین کی نوطرزِ مرصع اور شاہ عالم ثانی کی عجائب القصص تک، جو فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی اہم تصانیف ہیں۔ یوں اس مقالے کو ابتدا سے فورٹ ولیم کالج، یعنی اٹھارویں صدی کے آخر تک کے اہم دریافت نثر پاروں تک محدود کیا گیا ہے۔

ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں اُردو زبان کے خط وخال متعین ہو چکے تھے۔ اس میں شاعری بھی ہونے لگی۔ طوطیِ ہند امیر خسرو نے بھی اُردو شعر کہے لیکن اردو نثر اس زمانے میں پیدا نہ ہو سکی۔ غالباً اس لیے کہ ادبی لحاظ سے تقریباً ہر زبان کی طرح اردو میں بھی جذبے کے اظہار کا اولین ذریعہ شاعری تھی۔ نثر کا وجود شاعری کے بعد سامنے آیا تاہم اس زمانے میں گفتگو کی زبان کے چند نمونے اس دور کی فارسی تصانیف میں مل جاتے ہیں۔ یہ جملے یا فقرے ان صوفیائے کرام کے ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اردو زبان کو برتا اور رشد وہدایت کے لیے فارسی کے علاوہ عام بول چال کی زبان کو بھی اختیار کیا۔ مثلاً حضرت بابا فرید گنج شکر اور مادر موٗمناں کے درمیان مکالمہ اردو نثر کا قدیم ترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ جب حضرت بابا فرید نے اپنے ایک مرحوم خلیفہ کے کم عمر صاحب زادے کو خرقۂ خلافت عطا کیا تو مادر موٗمناں نے کہا ''خوجا، برہان الدین بالا ہے'' حضرت بابا فرید نے جواب دیا ''مادر موٗمناں: پونیوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔''(۱)

ان فقروں میں اردو زبان واضح طور پر متشکل نظر آتی ہے۔ لیکن ان جملوں یا فقروں کو، جو اتفاقاً فارسی تصنیف میں درج ہو گئے ہیں، اُردو نثر کا آغاز قرار دینا درست نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عام کاروباری اور معاشرتی روابط میں اُردو زبان کا استعمال ساتویں صدی ہجری میں ہو گیا تھا۔

آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں شمالی ہند میں حضرت اشرف جہانگیر سمنانی اور دکن میں شیخ عین الدین گنج العلم کے اردو رسائل کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ رسائل موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں کوئی بات کرنا ممکن نہیں۔ اُردو نثر کا قدیم ترین نمونہ جو مطبوعہ صورت میں دستیاب ہے وہ تصوف ومعرفت پر ایک رسالہ ہے جس کا نام 'معراج العاشقین' ہے۔ اس رسالے کو حضرت بندہ نواز گیسودراز سے منسوب کیا جاتا ہے، جو غلط ہے۔ تاریخ ادب اردو میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس پر مفصل بحث کی ہے اور کتاب بعنوان معراج العاشقین کا مصنف: از ڈاکٹر حفیظ قتیل، مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۱۹۶۸ء کے حوالے سے اس غلطی کی تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خواجہ بندہ نواز گیسودراز (م ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء) (جو فیروز شاہ بہمنی کے زمانے میں گلبرگہ آئے) کی تصنیف 'معراج العاشقین' بھی، جو اب تک اردو کی پہلی نثری تصنیف مانی جاتی ہے، نہ صرف اس دور کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کے مصنف خواجہ گیسودراز کے بجائے مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری ہیں جنھوں نے گیارھویں صدی ہجری کے نصف آخر یا بارھویں صدی کے اوئل میں 'تلاوۃ الوجود' کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس کی مزید تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ شاہ محمد علی سامانی نے جو بارگاہ خواجہ بندہ نواز کے مرید و خادم تھے، 'سیر محمدی' کے نام سے جو تالیف ۸۳۱ھ/۱۴۲۷ء میں کی تھی اور جس کے باب پنجم میں بندہ نواز کی ۳۷ تصانیف کا ذکر ملتا ہے، کسی اردو تصنیف کا حوالہ نہیں ملتا۔ اسی طرح خواجہ بندہ نواز کے بڑے صاحب زادے سید محمد اکبر حسینی (م ۸۱۲ھ)، (جو ان کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے) کے کسی رسالے کو ان کی تصنیف مان لینے کا اہلِ تحقیق کے پاس، جذباتی تحقیق کے علاوہ، کوئی جواز نہیں ہے۔''(۲)

دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد یہاں اردو زبان کو خاص اہمیت حاصل ہوئی اور اُردو زبان سے لگاؤ کا یہ سلسلہ بعد میں دکن کی اسلامی سلطنتوں قطب شاہی اور عادل شاہی وغیرہ میں جاری رہا۔ جس کے نتیجے میں یہاں اُردو زبان میں شعری اور نثری تصانیف کثیر تعداد میں نظر آتی ہیں۔ تاریخ کا یہ وہ دور ہے جب شمالی ہند میں تصنیف و تالیف کے لیے فارسی زبان استعمال ہو رہی تھی۔

اس دور میں علما اور صوفیا نے دینی مسائل کو بیان کرنے کے لیے اُردو نثر میں کثرت سے رسائل لکھے۔ ان مصنفین میں حضرت بندہ نواز گیسودراز کے بیٹے سید محمد اکبر حسینی اور پوتے عبداللہ الحسینی کے علاوہ شمس العشاق میراں جی، برہان الدین جانم، محمود خوش دہاں، میراں جی خدا نما، امین الدین، مُلا وجہی، شاہ میراں یعقوب، عابد شاہ، مولانا عبداللہ، سید شاہ میر وغیرہ کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔ ان مصنفین میں مُلا وجہی کے سوا باقی سب لوگ بنیادی طور پر علما تھے، ادیب نہیں تھے۔ ان کا مقصد تبلیغِ دین تھا۔ اس لیے دینی مسائل، اخلاقی حقائق اور صوفیانہ رموز کو سیدھے سادے انداز میں پیش کر دینا ان کے لیے کافی تھا۔ اُسلوب پر ان کی نظر نہیں تھی۔ مذکورہ بالا مصنفین میں سے چند ایک کی نگارشات کو اگر ہم مثالاً سامنے رکھ لیں تو ان کے نثری اسلوب پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔

شرح مرغوب القلوب از شاہ میراں جی شمس العشاق:

''ہور اس عالم میں خوبیاں دیوے گا۔ کہیا ہے اپس کوں پچھانے جو گا کہ ہور پرہیز گاراں کوں۔ پیغمبر علیہ الصلوۃ کہے خدا کی آشنائی جسے کوئی بوجھتا ہے۔ تو کیا توں رہ کرا نو تھے بوج۔

> انوتھی سن ہور چپ نکوا چہ۔اس چار باتاں کا پند ہے۔یوں شریعت میں پہلے پاؤں رکھ کہ طریقت شریعت تنج ہے۔"(۳)

احکام الصلوٰۃ از مولانا عبداللہ:

> "بات کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ہی واہ کہنے سوں نماز جاتا ہے۔دردسوں معیبت سوں نماز جاتا ہے۔رونے سوں یا دنیا کے سبب سوں نماز جاتا ہے۔نماز میں کسی موت کی خبر سُن کر بولنے سوں نماز جاتا ہے۔خبر عجب سُن کر نماز جاتا ہے۔"(۴)

اس اقتباس میں صوتی ساخت شعر کے بہت قریب ہے۔ردیف کا اہتمام شعوری معلوم ہوتا ہے۔اس میں فارسی کا بھی اثر ہے اور یہ سبب بھی ہے کہ حفظ کے لیے یا خطابت کے نقطۂ نظر سے صوتی اور لفظی تکرار موثر ہے۔

شمائل الاتقیا از شاہ میراں یعقوب:

> "موحداں کے پیشوا،مریداں کے دستگیر،طالبان کے رہنما،بوجھارے علم لدنی کے سو جھارے حقیقتاں دین ودنیا کے۔پیر پیراں سید میراں چشتی قدس اللہ سرہ،کی خدمت میں پایا۔ہور باطن کے عالم تے ظاہر کے عالم میں لیایا۔ہمیشہ ان کی عنایت کی نظر سوں پرورش پاتا تھا ہور دن دن اس شعور اور اس ہوش میں آتا تھا۔"(۵)

دکنی نثر کے تدریجی ارتقا کی درج بالا مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نثر نگار ادائے مطلب کی کوشش کر رہے ہیں۔کسی خاص قسم کے اُسلوب کے پیدا کرنے کی اُنھیں فکر نہیں۔اس اظہار میں ایک قسم کی سادگی،بھول پن اور بدویت پائی جاتی ہے۔نثر میں سادگی کے ساتھ ساتھ خلوص بھی موجود ہے جس سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔لیکن اس میں ادب وانشا کی جولانی مفقود ہے۔البتہ یہ بات واضح ہے کہ لکھنے والوں کے سامنے فارسی نثر کا اُسلوب موجود ہے اور کہیں کہیں ضرورت کے تحت وہ اس کی پیروی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔جیسا احکام الصلوٰۃ کے اقتباس میں فقروں کے آخری جملے ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں۔

اس سادہ نثر کے مقابلے میں مُلا وجہی کی تصنیف "سب رس" میں جو اُسلوب ملتا ہے،اُسے سادہ کے بجائے پُر تکلف نثر کہنا چاہیے۔مُلا وجہی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں 'سب رس' لکھی جسے اُردو میں ادبی نثر کا نقطۂ آغاز کہا جاتا ہے۔سب رس کا قصہ طبع زاد نہیں ہے۔یہ قصہ ملا وجہی نے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی تصنیف 'دستورِ عشاق' کے نثری خلاصے قصۂ حسن و دل سے لیا ہے۔لیکن جس چیز نے اسے ملا وجہی کی تخلیق بنا دیا ہے،وہ مُلا وجہی کا وہ اُسلوب ہے جس میں اُس نے فارسی کے رنگین اور پُر تکلف اُسلوب کی پیروی کی ہے۔اس لحاظ سے وجہی کا یہ دعویٰ قابلِ لحاظ ہے:

''جیتے چوساراں، جیتے فہم داراں جیتے گن کاراں ھوے سن آج لگن، کوئی اس جہاں میں، ھندوستان میں ھندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ھور نثر ملا کر گلا کر یوں نیں بولیا۔اس بات کوں اس نبات کوں یوں کوئی آب حیات میں نیں گھولیا، یوں غیب کا علم نیں کھولیا۔''(٦)

سب رس کے حوالے سے مولوی عبدالحق بجا طور پر لکھتے ہیں:

''یہ کتاب ادبی نظر سے قدیم اُردو میں خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔قصہ بھی عجیب ہے اور طرزِ بیان بھی عجیب۔مصنف نے ایک عام اور عالم گیر حقیقت کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور حُسن وعشق کی کش مکش اور عشق ودل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے۔''(٧)

قدیم اُردو نثر کے اس مختصر جائزے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو نثر کے اس ابتدائی دور میں سادا اور پُرتکلف دونوں اُسلوب معرضِ وجود میں آ چکے تھے۔اگر علما اور صوفیا کی تحریریں مدعا نویسی کی وجہ سے سادگی کا میلان رکھتی تھیں تو ان کے مقابلے میں مُلّا وجہی نے فارسی کے رنگین اور پُرتکلّف مقفّیٰ مسجع اُسلوب کی پیروی کر کے اُردو نثر کو ادبی اظہار کی اُس سطح پر پہنچانے کی کوشش کی جو اُس زمانے کے تہذیبی شکوہ کے مطابق مقبول تھی اور بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: ''اہلِ علم وادب اپنے اپنے طور پر اس فکر میں غلطاں ہیں کہ کس طرح اپنے خیالات، اثر آفرینی کے ساتھ، اس زبان میں پیش کیے جائیں تا کہ یہ زبان بھی، فارسی زبان کی طرح، اہلِ ہنر کا کمال بن جائے۔۔۔یہ زبان بازار ہاٹ اور گلی کوچوں سے نکل کر دربارِ معلی میں بھی پہنچ گئی ہے۔صوفیاے کرام عرفانِ ذات کے رازہاے سربستہ اسی زبان میں بیان کر رہے ہیں۔علماے دین تبلیغ کا کام اسی سے لے رہے ہیں۔اہلِ علم وادب اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا خون اسی میں شامل کر رہے ہیں۔داستان گو اسی کے ذریعے دلچسپی وتفریح کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں۔اس دور میں اُردو زبان کے عام رواج اور ادبی سطح پر ترقی کا سبب یہ تھا کہ سماجی، معاشی اور تہذیبی حالات کے بدلنے سے عوام کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی تھی اور اسی رُجحان کے ساتھ ان کی زبان کو بھی فروغ حاصل ہو رہا تھا۔''(٨)

یوں اُردو کے فروغ وارتقا کا سفر دکن میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔اگر چہ اُردو نثر کی زیادہ مضبوط روایت نہیں ہے۔اس کی بین وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بہت سا نثری ادب دست بُردِ زمانہ ہو چکا ہے لیکن اُس کی بازگشت اب بھی کہیں کہیں سے سُنائی دے جاتی ہے۔خصوصاً نثری قصوں کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین کا موقف ہے:

''دکنی نثر میں افسانہ طرازی کا افتتاح خاصہ جلدی ہو گیا تھا لیکن نثری قصے کو کوئی مقبولیت

حاصل نہ ہو سکی۔۱۸۰۰ء تک کے دکنی قصوں کی تعداد دو درجن سے زیادہ نہیں۔ان میں حکایات کے مجموعے بھی شامل ہیں۔قصہ گوئی انسان کو بالطبع مرغوب ہوتی ہے۔اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ دکنی ادب کی چار صدیوں میں محض بیس یا تیس افسانے ہی تحریر کیے گئے ہیں۔یقیناً کہیں زیادہ تصنیف کیے گئے ہوں گے لیکن وہ آج ہمارے بیچ موجود نہیں۔اگر ہیں تو کہیں گوشۂ گمنامی میں مدفون پڑے ہیں۔"(۹)

دکنی دور کے بعد شمالی ہند میں اُردو نثر کا آغاز فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" سے ہوتا ہے جو سب رس کے پورے ایک سو سال بعد (۱۱۴۵ھ / ۳۳-۱۷۳۲ء) تصنیف یا ترجمہ ہوئی۔ بعد ازاں (۱۱۶۱ھ/۴۸-۱۷۴۷ء) میں فضلی نے اس پر نظرِ ثانی کی۔کربل کتھا کے دیباچے میں فضلی نے لکھا ہے:

"پھر دل میں یہ گزرا کہ ایسے کام کرام کوں عقل چاہیے کامل اور مدد کسو طرف کی ہووے شامل کیوں کہ بے تائیدِ صمدی و بے مددِ جنابِ احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہرِ مُراد رشتۂ اُمید میں نہ آوے والہٰذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب لگ ترجمۂ فارسی بہ عبارتِ ہندی نہیں ہوئے مستمع۔پس اس اندیشۂ عمیق میں سر بہ گریبانِ تفکر ڈال دریائے اندوہِ تحیر میں غوطہ کھایا اور بیابانِ تامل اور تدبر میں سرگشتہ ہوا۔"(۱۰)

فضلی کی کربل کتھا اُردو ادب کے طلبہ کے لیے کوئی غیر معروف تصنیف نہیں ہے۔یہ کتاب شمالی ہند میں اُردو نثر کا پہلا نقش ہے۔کربل کتھا محمد شاہی دور میں لکھی گئی جب شمالی ہند میں اُردو شاعری کا آغاز ہوا۔فضلی کے سامنے دکن کے نثری نمونے نہیں تھے اس لیے شمالی ہند میں اسے پہلا نثر نگار کہا جا سکتا ہے جس نے ایک نئی راہ پیدا کی۔کربل کتھا عوام الناس خصوصاً خواتین کے تقاضے پر اُردو میں لکھی گئی تھی۔چوں کہ یہ خواتین فارسی سے ناواقف تھیں اور روضۃ الشہدا کی فارسی کو سمجھنے سے قاصر تھیں اس لیے ان کی شمولیت کی خاطر فضلی نے روضۃ الشہدا کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ترجمہ کرتے ہوئے فضلی نے عام بول چال کی زبان کی پیروی کی ہے۔فضلی نے فارسی کے پُرتکلف انداز سے بچنے کی عام طور پر کوشش کی ہے کیوں کہ جس مقصد اور جن لوگوں کے لیے وہ یہ کتاب لکھ رہا تھا اُن کے لیے یہی صورت ممکن تھی۔باایں ہمہ کہیں کہیں اس کی عبارتوں میں قوافی بھی آجاتے ہیں اور فارسی کی تراکیب بھی۔خاص طور پر دیباچے میں یہ رنگ غالب ہے۔کربل کتھا کی زبان زیادہ صاف نہیں،فقرے بھی بعض جگہ ادھورے رہ جاتے ہیں۔تاہم بیانیہ نگاری،مواقع کی تصویر کشی اور مکالموں کے سلسلے میں شمالی ہند میں اُردو نثر کا یہ نقشِ اول ایک اچھی کوشش ہے۔

فضلی کی "کربل کتھا" سے تحسین کی "نوطرزِ مرصع" تک اُردو نثر کے زیادہ نمونے نہیں ملتے،اس لیے کہ اس زمانے میں فارسی نثر ہی کا بول بالا تھا۔تاہم شاعری کے بعد آہستہ آہستہ نثر کی طرف توجہ ہو رہی تھی۔

اوراس نثر میں بھی دو طرزیں ملتی ہیں ۔ایک سادہ طرز جس میں کربل کتھا کے بعد قرآن مجید کے تراجم، بائبل کے تراجم کے علاوہ شاہ عالم ثانی کی تصنیف ''عجائب القصص'' کو شامل کیا جا سکتا ہے ۔عجائب القصص کا انداز داستانوی ہے جس میں دلی کا معیاری روزمرہ اور محاورہ سادہ انداز میں برتا گیا ہے اور دوسری طرف پُر تکلف اور رنگین نثر جس کا اہم ترین نمونہ ''نوطرزِ مرصع'' ہے ۔شمس الرحمٰن فاروقی کربل کتھا سے نوطرزِ مرصع تک کے دورانیے کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ُاس (کربل کتھا) کے بعد عیسوی خان بہادر کا داستان نما قصہ مہر افروز ودلبر ہے ۔یہ عیسوی خان بہادر کون اور کیا تھے، یہ ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا ہے ۔لیکن قصہ مہر افروز ودلبر' کی تاریخ ۱۷۳۱ء اور ۱۷۵۵ء کے درمیان متعین کی گئی ہے ۔ان کے علاوہ ہری ہر پرشاد سنبھلی (زمانہ ۱۷۳۰ء کے آس پاس) اور بندرابن متھروی (وفات: ۱۷۵۷ء) ہیں جن کی ایک دو تاریخی تصانیف معلوم ہیں ۔سودا (۱۷۰۶ء۔۱۷۸۱ء) نے اپنی مثنوی 'سبیل ہدایت' میں چند صفحات کی عبارت اُردو میں لکھی ۔حسین عطا تحسین کی داستانی تصنیف 'نوطرزِ مرصع' ۱۷۷۵ء اٹھارویں صدی کی دہلوی اُردو نثر کا تیسرا سب سے مبسوط، اور موجود نمونہ کہی جا سکتی ہے ۔''(۱۱)

نوطرزِ مرصع کے اُسلوب پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں: ''نوطرزِ مرصع میں ہمیں تین اسالیب ملتے ہیں ۔ایک وہ جو ہمارے روایتی طرزِ احساس سے مطابقت رکھتا ہے جس میں استعاروں کے ذریعے بات کی جاتی اور مسجع و مقفیٰ عبارت سے تخیل میں رنگ بھرے جاتے ہیں ۔اس پر فارسی جملے کی ساخت کا اثر غالب ہے ۔یہ اُسلوب پہلے درویش کی داستان میں نمایاں ہے ۔دوسرا وہ اُسلوب ہے جہاں یہ اُسلوب سادہ و عام فہم عبارت کے ملنے سے پھیکا پڑنے لگتا ہے ۔تیسرا وہ اُسلوب ہے جو داستان میں فرنگی کرداروں کے آنے کے بعد، سادہ و عام فہم ہو جاتا ہے اور جس کے اکثر حصے میر امّن کی 'باغ و بہار' اور شاہ عالم ثانی کی 'عجائب القصص' کی نثر سے مماثل ہیں ۔نوطرزِ مرصع، جہاں اپنے مخصوص طرز کی وجہ سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے وہاں اس کے دوسرے اسالیب، بدلتے ہوئے معاشرتی وسیاسی حالات کے زیرِ اثر، ہمارے بدلتے ہوئے طرزِ احساس کا پتا دیتے ہیں ۔''(۱۲)

نوطرزِ مرصع کی رنگین نثر کے بعد سادہ طرز کے حوالے سے عجائب القصص کو اُردو نثر میں اہم مقام حاصل ہے ۔عجائب القصص کا قصہ شاہ عالم ثانی نے ۱۲۰۷ھ / ۹۳۔۱۷۹۲ء میں تالیف کیا ۔اس داستان میں اُردو زبان کا معیاری لب و لہجہ صاف نظر آتا ہے ۔شاہ عالم ثانی نے اس کی تالیف کا سبب کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے: ''جب چند دیوان بزبانِ فارسی اور بزبانِ ریختہ ارشادِ حضور والا مرتب ہوئے اور کتابت، دو ہرے حد سے گزرے، یکا یک یہ مزاجِ اقدس ارفع اعلیٰ میں آیا کہ قصہ زبانِ ہندی میں بہ عبارت نثر کہیے اور کوئی لفظ اس میں غیر مانوس اور خلافِ روزمرہ اور بے محاورہ نہ ہو، اور عام فہم اور خاص پسند ہووے کہ جس کے استماع

سے فرحت تازہ اور مسرت بے اندازہ مستمع کو حاصل ہو اور آداب سلطنت اور طریق عرض و معروض دریافت ہوں اور اگر جاہل پڑھے تو اس کے فیض سے عالموں سے بہتر گفتگو اور بول چال بہم پہنچائے۔"(۱۳)

عجائب القصص داستان کا اُسلوب ہمیں اُردو زبان کے محاورے اور روزمرے کے بہت قریب نظر آتا ہے۔بول چال کا انداز رواں ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو زبان اصلاح و ترمیم کے مراحل طے کر کے ادبی معیار تک پہنچ چکی ہے۔اس قصے کا طرزِ تحریر تبدیل شدہ اُسلوب کے علاوہ تہذیبی و سیاسی اور معاشرتی فضا کے نئے راستوں کا آغاز ہے۔

درج بالا اردو کی قدیم نثر کے اجمالاً جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اردو نثر نے اپنا معیاری اسلوب متعین کرنے میں ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔مختلف تجربات سے گذرنے کے بعد اردو نثر کا سادہ اور سلیس اسلوب واضح ہوا،اور پھر اس کے وہ خال وخد نظر آئے ہیں جنھیں ہم زیادہ نکھری صورت میں فورٹ ولیم کالج کی اردو نثر میں دیکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سیرالاولیا،سید محمدبن سید مبارک کرمانی،دہلی،مطبع محبِ ہند،۱۳۰۲ھ،ص ۱۸۳

(۲) جمیل جالبی،تاریخ ادبِ اُردو:جلداوّل،لاہور،مجلسِ ترقی ادب،جولائی ۱۹۷۵ء،ص ۱۵۹،۱۶۰

(۳) مولوی عبدالحق،اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاے کرام کا کام،کراچی،انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۹۳ء،ص ۵۷

(۴) سید عبداللہ،میر امن سے عبدالحق تک،لاہور،مجلسِ ترقی ادب،مئی ۱۹۶۵ء،ص ۱۱،۱۲)

(۵) محی الدین قادری زور،دکنی ادب کی تاریخ،کراچی،اُردو اکیڈمی سندھ،ستمبر ۱۹۶۹ء،ص ۸۶)

(۶) ملاوجہی،سب رس،مرتب:مولوی عبدالحق،کراچی،انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۵۳ء،ص ۱۱

(۷) ایضاً،ص ۵،۶

(۸) جمیل جالبی،تاریخ ادبِ اُردو،جلددوم:حصہ دوم،لاہور،مجلسِ ترقی ادب،جون ۱۹۸۲ء،ص ۹۸۳

(۹) گیان چندجین،اردو کی نثری داستانیں،کراچی،انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۱۴ء،ص ۱۱۹،۱۲۰)

(۱۰) فضل علی فضلی،کربل کتھا،دہلی،شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی،بھارت،مارچ ۱۹۶۱ء،ص ۲۸

(۱۱) شمس الرحمٰن فاروقی،اُردو کا ابتدائی زمانہ،کراچی،آج،۲۰۰۹ء،ص ۱۰۵،۱۰۶

(۱۲) جمیل جالبی،تاریخ ادبِ اُردو،جلددوم:حصہ دوم،لاہور،مجلسِ ترقی ادب،جون ۱۹۸۲ء،ص ۹۹۵

(۱۳) شاہ عالم ثانی،عجائب القصص،مرتب:راحت افزا بخاری،لاہور،مجلسِ ترقی ادب،جنوری ۱۹۶۵ء،ص ۲۶